عائشہ صدیقہؓ، یا قرآن مجید میں کمی واقع ہونے کا عقیدہ یا غلط فی الوحی، یا حلت تبرا یعنی سبّ وشتم وغیرہ، یا جیسے مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کا فتویٰ موجود ہے کہ:

''اگر نذیر احمد غالی شیعہ ہوگیا ہے یعنی حضرت عائشہؓ پر تہمت کا قائل ہے یا قرآن مجید کو صحیح اور کامل نہیں سمجھتا یا حضرت ابوبکر صدیق کی صحبت کا منکر ہے یا حضرت علی کو وحی کا اصل مستحق سمجھتا ہے یا حضرت علی کی الوہیت کا قائل ہے تو بے شک وہ کافر ہے'' (کفایت المفتی جلد اول، صفحہ نمبر ۲۸۰)

اب فاضل مضمون نگار ہی بتائیں کہ یہ عقائد کن لوگوں کے ہیں؟ قادیانیوں کے، دیوبندیوں کے، بریلویوں کے یا اہل حدیثوں کے؟ ایک ہی جواب آئے گا کہ یہ عقائد اثناعشری شیعوں کے ہیں، اور اس وقت دنیا میں اکثریتی آبادی بمقابلہ اسماعیلی ونصیری انہی کی ہے۔ اگرچہ ان کے عقائد بھی خلاف اسلام ہیں۔

آج دنیا گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے ہر فرقے اور ہر مسلک کی تقریریں، تحریریں اور لب ولہجہ ایک چھت کے نیچے فراہم کر دیا ہے۔ اب نہ تو وہ زمانہ رہا ہے جب علامہ ابن عابدین شامی کو شیعہ لٹریچر نہیں ملتا تھا اور نہ وہ دن رہے جب مولانا محمد منظور نعمانی انڈیا سے حضرت اقدس مولانا قاضی مظہر حسین کو خط لکھ کر شیعہ مذہب کی کتابیں منگواتے تھے کہ یہاں انڈیا میں اکثر نایاب ہیں...... آج بحث وتمحیص کے بازار گرم ہیں، جب کوئی پڑھا لکھا مسلمان شیعہ علماء کی کتابوں میں صحابہ پر غلیظ الزامات دیکھتا ہے، تقریروں میں تبرا سُنتا ہے۔ ترجمہ مقبول میں ''شراب خور خلفاء کی خاطر قرآن بدل دیا گیا'' جیسے رکیک جملے پڑھتا ہے۔ ''تجلیاتِ صداقت'' میں ''اصحابِ رسول ایمان سے تہی دامن تھے'' جیسی عبارتیں پڑھتا ہے۔ غلام حسین نجفی، عبدالکریم مشتاق، اشتیاق کاظمی، محمد حسین ڈھکو، اور دنیا بھر کے شیعہ علماء کی عربی، اردو اور فارسی زبان میں سوقیانہ اور واضح خلافِ اسلام باتیں پڑھ سُن کر جب ہمارے مفتیانِ عظام کے ایسے مضامین پر نگاہ ڈالتا ہے تو دو نتائج سامنے آتے ہیں، تیسرا کوئی نہیں۔

1۔ یا تو اس کے جذبات مزید مجروح ہوتے ہیں، پہلے وہ شیعیت سے بدظن تھا، اب سُنیوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا کہ ایسے صریح کفریہ عقائد رکھنے والے مسلمان ہیں تو پھر کُفر کس مگر مچھ کا نام ہے؟

2۔ یا وہ بھی دھنیا پی کر اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جب یہ سب کچھ کفر نہیں تو پھر ہمیں بھی صحابہ کے گریبانوں میں ہاتھ ڈال کر طبع آزمائی کر لینی چاہیے۔ پھر یہ تشکیک کے جراثیم بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کاش فاضل مضمون نگار محض ماہنامہ ''الشریعہ'' کو نہ دیکھتے، زمینی حقائق، نفسیاتی تلاطم، عملی واعتقادی خرابیوں کے نتائج اور موقع و ماحول کے تقاضوں کو اہلِ افتاء نہیں سمجھیں گے تو کیا ہم بے لگام خطیبوں سے یہ توقع رکھیں؟ فتویٰ دینے کا اہل کون ہے؟ بصد معذرت، ہم یہاں اپنے قارئین سے مخاطب ہیں نہ کہ فاضل مضمون نگار سے، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے آج سے چھہتر سال پہلے ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا۔

''فتویٰ دینے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ عالم، صاحب بصیرت، کثیر المطالعہ، وسیع النظر، احوالِ زمانہ سے واقف ہو''۔ (کفایت المفتی جلد۲، ص ۲۳۶)

یہ دوسطریں گویا ''دریا بہ کوزہ'' کا مصداق ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ امام شعبی سے لے کر محدثین دہلی تک، خاندانِ شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا محمد قاسم نانوتوی تک، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی سے لے کر حضرت اقدس مولانا قاضی مظہر حسین تک سب کے سب رفض و بدعت کے خلاف ایک ہی نہج پہ چلے ہیں، ان میں برداشت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر غیرت غالب تھی۔ ہمارے آج کے فلاسفر اور دانشور فرصت نکال کر عدمِ برداشت اور غیرتِ دینی کے مابین فرق کو بھی ذرا واضح کر دیں تو احسان ہوگا۔

حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی تحمل و برداشت کا کوہِ گراں تھے۔ اگر ان میں جذباتیت، اور عدمِ برداشت کا عنصر ہوتا تو آج فکرِ دیوبند سکہ رائج الوقت نہ ہوتی۔ آج ہند و پاک میں علوم و فیوض کے جو چشمے بہہ رہے ہیں، ان کا سرچشمہ حضرت نانوتوی کی عالی ظرفی ہی تو ہے، مگر یہی سراپائے علم جب شیعیت کے خلاف قلم اُٹھاتا ہے تو پھر یوں بھی لکھا نظر آتا ہے۔

> ''اصحابِ ثلثہ کو اول تو مولوی عمار علی صاحب (شیعہ، ناقل) جیسوں کی اہانت یا برا کہنے سے کیا نقصان؟ بلکہ الٹا باعثِ رفعتِ شان ہے۔ چاند، سورج کی طرح وہ روشن ہوئے تو کتے ان پر بھونکے، اوروں پر کیوں نہ بھونکے''۔ (ہدیۃ الشیعہ، صفحہ نمبر ۲۲۳)

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی سے آغا خانی شیعوں کے عقائد لکھ کر فتویٰ مانگا گیا کہ آیا ہم انہیں مسلمان کہہ سکتے ہیں؟ تو حضرت تھانوی نے تفصیلی فتویٰ جاری فرمایا اور اس کی آخری سطور مندرجہ ذیل ہیں:

> ''خلاصہ یہ ہے کہ جب ان کفریات کے ہوتے ہوئے کسی کو مسلمان کہا جائے گا تو ناواقف مسلمانوں کی نظر میں ان کفریات کا قبح خفیف ہو جائے گا اور وہ آسانی سے ایسے گمراہوں کا شکار ہو سکیں گے تو کافروں کو اسلام میں داخل کہنے کا انجام یہ ہوگا کہ بہت سے مسلمان اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ کیا کوئی مصلحت اس مفسدہ کی مقاومت کر سکے گی۔'' الخ (بوادر النوادر، صفحہ نمبر ۷۴۱)

نوٹ۔ یہ کتاب حضرت تھانوی کی زندگی کی آخری تصنیف ہے اور آخری اعمال واقوال کا پہلوں کے مقابلہ میں معتبر ہونا مسلّمہ ہے۔ (جاری)

**جہاد۔ ایک مطالعہ (از عمار ناصر) پر ناقدانہ نظر**

از قلم: محمد امتیاز عثمانی

رابطہ: 0333-5154969

**مباحثہ ومکالمہ**

# مکاتیب

(۱)

محترم جناب محمد عمار خان ناصر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''خاطرات'' کے سلسلے میں ماشاء اللہ نہایت اہم اور فکر انگیز تحریریں شائع ہو رہی ہیں۔ ربِّ کریم آپ کو اس کے تسلسل اور دین کے حوالے سے سامنے آنے والے جدید چیلنجز کے مقابلہ کی ہمت ارزانی فرمائے۔ ''الشریعہ'' جون ۲۰۱۳ء کے خاطرات میں آپ نے ''عہد نبوی کے یہود اور رسول اللہ کی رسالت کا اعتراف'' کے زیر عنوان دینی مدارس کے طلبہ واساتذہ کے اس المیے کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ نہ صرف بالعموم جدید علوم سے واقفیت حاصل نہیں کرتے بلکہ اپنے روایتی علمی ذخیرے سے بھی نابلد ہیں۔ ان کے سامنے جب کوئی ایسی علمی بات کی جاتی ہے جو ان کی محدود نصابی آموخت سے مختلف ہوتی ہے تو وہ اسے فوراً گمراہی، بے راہ روی اور بدعت وتحریف پر محمول کرنے لگتے ہیں، اور اس طرف ان کا ذہن ہی نہیں جاتا کہ یہ بات قدیم علمائے اسلام کے ہاں بھی موجود ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے چند گنے چنے علما ہی کو علم کی کل کائنات سمجھتے ہیں۔ یہ بات آپ نے اس تناظر میں کہی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی بحث میں آپ نے سورہ البقرہ کی آیات ۷۶ اور ۹۱ کی روشنی یہ ذکر کیا تھا کہ عہد نبوی کے بعض یہود حضور کو بنی اسماعیل کا نبی تسلیم کرتے تھے اور تنقید نگار نے اسلامی ذخیرہ علم سے عدم واقفیت کی بنا پر اس کو تحریف سے تعبیر کیا ہے۔ پھر آپ نے بخاری، فتح الباری اور طبری کے حوالے سے اپنے موقف کو موکد کیا ہے۔

محترم عمار صاحب! آپ تو اسلاف کے ہاں موجود کسی ایسے تفسیری نکتے کو ماننے کی بات کر رہے ہیں جو ہمارے علما کے ہاں معلوم ومعروف نہ ہو۔ ذرا غور کیجیے کہ اس تفسیری نکتے سے متعلق ان کا رویہ کیا ہوگا جو اسلاف کے ہاں موجود نہ ہو۔ حالانکہ راقم الحروف کی ناقص رائے میں دلائل موجود ہوں تو ایسے کسی نکتے سے بھی ابا ضروری نہیں۔

اگر، جیسا کہ ہمارے علما بھی بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتے، قرآن ہر زمانے اور قیامت تک کے تمام بنی نوع انسان کے لیے رہنمائی کا سامان ہے۔ اور اقبال کا یہ بیان حقیقت ہے کہ قرآن کی حکمت قدیم ولا یزال ہے (آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم۔ حکمتِ اولا یزال است وقدیم)، اس کی آیات میں سینکڑوں نئے جہان موجود اور اس کے لمحات میں ان گنت زمانے بند ہیں (صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست۔ عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست)، تو پھر اس سے نئے زمانے میں کسی نئے نکتے کے اخذ کرنے پر ناک بھوں چڑھانے کی کیا گنجائش ہے!